رضوان اللہ

ایمان ہی نجات کی دلیل ہے

(۲)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن میں رسولوں کے بارے میں یہ حقیقت بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے کہ اُن کی دعوت جب اِتمام حجت اور براءت کے مراحل طے کر لیتی ہے تو خدا کی طرف سے اُن کی قوم کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ چونکہ آخرت کے فیصلے کی تمہید ہوتا ہے، اِس لیے یہ بھی ایمان اور کفر کی بنیاد پر سنایا جاتا اور اس کے نتیجے میں آنے والے عذاب سے صرف اور صرف مومنین نجات پاتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت نوح کی دعوت بھی اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو گئی اور عذاب کا وقت آن پہنچا تو اُن سے بھی اسی اصول پر فرمایا گیا کہ وہ عذاب سے نجات کے لیے اپنے ساتھ ایمان والوں کو کشتی میں سوار کر لیں۔ ایمان کی بنیاد پر نجات کا یہ اصول قرآن کے ہر صفحہ پر ثبت اور اس کے ہر طالب علم پر مکمل طور پر واضح ہے، مگر اسے زمانے کی گردش ہی کہیں گے کہ آج مطلق نوعیت کے اس اصول میں بھی استثنا پیدا کر لیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت نوح کے خاندان کو اپنی نجات کے لیے ایمان ہی نہیں، بلکہ اُن کے خاندان میں سے ہونا بھی کفایت کرتا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ استثنا ایسا نہیں ہے جسے محض رائے کا اختلاف قرار دیتے ہوئے نظر انداز کر دیا جائے، بلکہ یہ اپنے نتیجے کے لحاظ سے اسلام کی بنیادی تعلیمات کے اوپر لایا گیا ایک استثنا ہے۔ چنانچہ ہم واجب سمجھتے ہیں کہ اس کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیں اور نجات کا یہ اصول خاص اس واقعۂ نوح کے تناظر میں بھی بیان کر دیں۔ سو اس کے لیے ہم قرآن میں سے

دو آیات کو پیش کریں گے جن میں بڑی صراحت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ باقی سب کی طرح نوح علیہ السلام کے خاندان کی نجات بھی صرف اور صرف ایمان لے آنے پر منحصر تھی۔

پہلی آیت

ارشاد ہوا ہے:

فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ فَاسۡلُكۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ وَاَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ مِنۡهُمۡ ۚ وَلَا تُخَاطِبۡنِىۡ فِى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ.(المومنون ۲۳: ۲۷)

''پھر جب ہمارا حکم آ جائے اور طوفان ابل پڑے تو اس میں ہر قسم کے جانوروں کے جوڑے رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو، ان میں سے سوائے ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہنا جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ وہ لازماً غرق ہو کر رہیں گے۔''

اس آیت میں پہلے دو باتیں اچھی طرح سے سمجھ لی جانی چاہییں: 'سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ' کی مراد اور لفظ 'اَهۡلَكَ' کا مطلب۔

سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ

عربی زبان میں قول کا مطلب ''بات'' ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ 'علی' کے استعمال نے یہاں دو چیزیں بالکل واضح کر دی ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد اب صرف بات نہیں، بلکہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فیصلہ 'عَلَيۡهِ' کی ضمیر کے مرجع کے خلاف ہے۔ اس قول پر آنے والا الف لام اور اس کے ساتھ فعل 'سبق' کا استعمال بھی سامنے رہے تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ پہلے سے سنا دیا ہوا فیصلہ ہے اور مزید یہ کہ اس سے نوح علیہ السلام اچھی طرح سے واقف بھی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ آخر ہے کیا؟ تو یہ وہی فیصلہ ہے جسے انھوں نے اپنی قوم کے سامنے یہ کہتے ہوئے بیان کر دیا تھا: 'يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ '[1] (میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔

۱۔ المومنون ۲۳: ۲۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پھر کیا (اُس کے شریک ٹھیرا کر تم اس کے غضب سے) ڈرتے نہیں ہو)۔ ان کی اس دعوت کا مطلب، ظاہر ہے، یہی تھا کہ جو لوگ صرف خدا کی عبادت کرنے کے بجاے اُس کے شریک ٹھیرائیں گے، اُن کے بارے میں خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اُس کے غضب کا شکار ہو کر رہیں گے۔ سو قرآن کے الفاظ اور اس کے سیاق کے لحاظ سے یہی 'سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کا حقیقی مصداق ہے۔ اس کے برخلاف، جن لوگوں نے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ اس کا مصداق نوح کے ''غیر اہل'' بھی ہو سکتے ہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی یہ بات کسی دلیل پر نہیں، بلکہ خالص قیاس پر مبنی ہے جو عالم اسباب سے ماورا ہو کر اور شاید عالم بے خودی میں جا کر کر لیا گیا ہے۔

اَهْلَكَ

آیت میں 'اَهْلَكَ' کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کا لغوی مطلب ہے: ''تمھارے اپنے لوگ''۔ کسی شخص کے یہ اپنے لوگ اُس کے اہل بھی ہو سکتے ہیں اور اُس سے خصوصی تعلق رکھنے والے دوسرے حضرات بھی کہ عربی زبان میں 'أہل' کا لفظ ان دونوں اطلاقات میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اس آیت میں یہ پہلے معنی میں آیا ہے، یعنی حضرت نوح کے خاندان کے لوگ۔ اس معنی کو ترجیح دینے کی ایک وجہ اس پر آنے والا 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ' کا استثنا ہے جو صرف اسی معنی پر موزوں ٹھیرتا ہے۔ دوسری صورت میں بات انتہائی غیر معقول ہو جاتی ہے، یعنی ''تم اپنے سے تعلق رکھنے والے متبعین کو سوار کرا لو اور ان میں سے اُنھیں سوار نہ کرانا جو فیصلے کی زد میں آئے ہوئے ہیں، یعنی تمھارے متبعین نہیں ہیں۔'' سو یہ بات قطعی ہے کہ یہاں 'اَهْلَكَ' کا مطلب خاندان نوح کے افراد ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مومنین کے عمومی لفظ کو چھوڑ کر 'اَهْلَكَ' کا لفظ کیوں اپنایا گیا؟ تو جان لینا چاہیے کہ یہ علی سبیل التغلیب کا اسلوب ہے اور اس کا استعمال اس لیے کیا گیا ہے کہ نوح پر زیادہ تر آپ کے خاندان کے لوگ ایمان لائے تھے، اس لیے مومنین کے اس معتدبہ حصے کا بیان کر دیا تو گویا سب مومنین کا بیان کر دیا گیا۔

'اَهْلَكَ' اور 'سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کی مراد جان لینے کے بعد اب آیت کا اصل مدعا بآسانی سمجھ لیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہو کر جب اپنے خدا سے دعا کی تو اُنھیں حکم ہوا کہ ایک کشتی ہمارے سامنے اور ہماری ہدایت کے مطابق تیار کرو۔ پھر جب فیصلے کا وقت آ جائے اور طوفان ابل پڑے تو 'فَاسْلُكْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ'۔ اس میں اپنی ضرورت کے تمام جانوروں کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جوڑے رکھ لینا۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'وَاَهْلَكَ'۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی اس میں سوار کرا لینا۔ کشتی میں سوار ہونے کا مطلب اصل میں خدا کے عذاب سے نجات پانا تھا اور وہ صرف ایمان والوں کا نصیب تھی، اس لیے آپ سے خصوصاً فرمایا گیا: 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ' کہ اپنے خاندان میں سے اُن افراد کو ہر گز اس میں سوار نہ کرانا جو ایمان والے نہ ہوں اور اس وجہ سے اُن پر خدا کا فیصلہ صادق آ چکا ہو۔ اس کے بعد یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ تمھارے خاندان میں سے جو لوگ تم پر ایمان نہ لائیں، وہ ظالم ہیں، اس لیے 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا'، ان ظالموں کی ہم دردی اور سفارش میں ہم سے کوئی بات نہ کہنا۔ 'اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ'، وہ بہر صورت غرق کر دیے جائیں گے۔

بلکہ آیت کے اصل مدعا کے ساتھ اگر پوری سورہ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ چیز اور زیادہ مؤکد ہو جاتی ہے کہ اہل نوح کے معاملے میں بھی نجات کا عام قانون ہی روبہ عمل ہونا چاہیے، اور انھیں کسی بھی صورت اس معاملے میں کوئی استثنا نہیں دینا چاہیے۔ چنانچہ سورہ کی ابتدا میں فرمایا ہے کہ وہ لوگ مراد کو پہنچ گئے جو ایمان والے ہیں، اور پھر انھی ایمان والوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت الفردوس کے مالک ہونے والے ہیں[۲]۔ اس کے بعد ماضی کی سرگذشتیں سنا کر اس قانون کو سلبی طریقے سے بھی بیان کیا ہے، اور واضح فرما دیا ہے کہ معذب قوموں پر عذاب آنے کا سبب یہی تھا کہ وہ لوگ ایمان والے نہیں، بلکہ ظالم، مکذبین اور پرلے درجے کے منکرین تھے[۳]۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسری آیت

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ.(ہود ۱۱: ۴۰)

''ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں ـــــ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔''

اس آیت کے متعلق بھی چند چیزیں جان لینی چاہییں: ایک عام بعد الخاص اور دوسرے تخصیص کا اسلوب۔

۲۔ المومنون ۲۳: ۱۰-۱۱۔

۳۔ المومنون ۲۳: ۴۱، ۴۴، اور ۴۸۔

عام بعد الخاص

قرآن کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس میں قدیم عربی زبان کی طرز پر خاص بات پر کسی عام بات کو بھی عطف کر دیا جاتا ہے۔ اسے عام بعد الخاص کا اسلوب کہا جاتا ہے اور اس سے مقصود کئی اہداف ہوا کرتے ہیں۔ قرآن میں عام طور پر اسے دو اہداف کے پیش نظر برتا گیا ہے: ایک تتمیم، یعنی بات کو مکمل کرنے اور دوسرے تعمیم، یعنی بات کو عام کر دینے کے لیے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیت میں 'وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ' کا عطف تتمیم کے لیے آیا ہے کہ ان الفاظ کے ذریعے سے حضرت نوح نے اپنی دعا کا اِتمام کیا اور اس طرح مغفرت کی اس دعا میں سبھی مسلمانوں کو شامل کر لیا ہے:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ. (نوح ۷۱: ۲۸)

''میرے مالک، تو مجھے معاف فرما دے، میرے ماں باپ کو معاف فرما دے، ان سب کو معاف فرما دے جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہو جائیں، سب مسلمان مردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے۔''

ذیل کی آیت میں 'وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ' کا عطف تعمیم کے لیے آیا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہتے ہوئے اپنے علم کا بیان عام کر دیا ہے کہ وہ صرف سینوں کی بات سے نہیں، بلکہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اُس سے بھی واقف ہے:

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ. (آل عمران ۳: ۲۹)

''ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے، اور زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسے بھی جانتا ہے۔''

اس روشنی میں سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری پیش کردہ آیت میں بھی 'اَهْلَكَ' کے لفظ پر 'مَنْ اٰمَنَ' کا عطف ہو جانا، نہ تو ''دراز گوئی'' ہے اور نہ کوئی ایسا راز کہ جسے پا لینے کے لیے کچھ دوسرے ''رازوں'' سے بھی پردہ اٹھانا ضروری ہو جائے۔ یہ بھی عام بعد الخاص کی نوعیت کا عطف ہے اور تعمیم کے لیے آیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کشتی میں سوار کرنے کے حکم کا دائرہ خاندان سے باہر کے مومنین کو بھی محیط ہو گیا ہے۔ یعنی اس کا مطلب اب یہ ہے کہ اے نوح، تم نہ صرف اپنے گھر والوں، بلکہ دوسرے مومنین کو بھی اس کشتی میں سوار کرا لو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تخصیص

کلام میں تخصیص کئی طرح سے پیدا کی جاتی ہے: ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے لیے حرف 'اِلّا' کو استعمال میں لایا جائے۔ یہ طریقہ اس قدر عام ہے کہ اس کی کوئی مثال دینا ہمیں عبث کی مشق لگتا ہے۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زیر بحث آیت میں 'وَاَهْلَكَ' کے لفظ پر اسی 'اِلّا' کے ذریعے سے تخصیص لائی گئی ہے۔ یہ جس پر آتی ہے اُس کے بعض افراد کو چونکہ اُس میں سے خارج کر دیتی ہے، اس لیے ایک بات تو یہ طے ہو گئی ہے کہ 'وَاَهْلَكَ' کے لفظ میں اب نوح کے خاندان کے سب افراد شامل نہیں رہے، بلکہ اُس کے بعض افراد، لامحالہ اِس میں سے خارج ہو گئے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ خاندان کے افراد ہونے کے باوجود، اس لیے خارج ہو گئے ہیں کہ وہ مشرک ہیں اور خدا کے فیصلے کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لینی چاہیے۔ کسی شے پر آنے والا عطف بالعموم مغایرت کو بیان کرتا ہے، مگر بعض اوقات یہ معطوف علیہ میں کوئی معنوی پہلو یا کسی درجے میں کوئی تخصیص بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان ہر دو قسم کے عطف میں امتیاز کرنے کا کام سیاق و سباق کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آیت میں فرمایا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا. (ہود ۱۱: ۹۴)

''جب ہمارا حکم صادر ہو گیا تو ہم نے شعیب کو اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، خاص اپنی رحمت سے نجات دی۔''

اس آیت میں 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ' کا عطف 'شُعَيْبًا' پر ہوا ہے۔ اور اس میں آنے والا 'مَعَهٗ' کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ یہ عطف مغایرت کے ساتھ ساتھ 'شُعَيْبًا' میں ایمان کا معنی بھی پیدا کر رہا ہے، اس لیے کہ اس کا مطلب صحیح لفظوں میں یہ ہے کہ ہم نے شعیب اور اُس کے ساتھ ایمان لانے کے عمل میں شریک دوسرے ایمان والوں کو بھی نجات دی۔

زیر بحث آیت میں بھی 'مَنْ اٰمَنَ' کا عطف ایک ہی وقت میں جس طرح یہ بتا رہا ہے کہ وہ 'اَهْلَكَ' کا غیر ہے، اسی طرح اپنے اندر موجود ایمان کا ایک رنگ بھی اس میں پیدا کر رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی معطوف اور معطوف علیہ، دونوں پر آنے والے آیت کے آخری الفاظ ہیں: 'وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ'۔ اور حقیقت میں یہی معنویت ہے جو 'اَهْلَكَ' کے لفظ میں ایک طرح کی تخصیص کا باعث ہو گئی ہے۔

تخصیص کا یہ طریق جان لیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک ہی لفظ میں ایک سے زیادہ پہلوؤں کا پیدا ہو جانا ہر گز محال نہیں ہے اور نہ کوئی نقض اور تضاد ہے، جیسا کہ بعض حضرات کو خیال ہوا ہے، اور اسی وجہ سے اُنھوں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے ایک مثال سے ہمیں باور کرانا چاہا ہے کہ مغایرت اور تخصیص کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اُن کی مثال یہ ہے: ''بیٹا، اپنے بچوں کو اور پاکستانی بچوں کو لیتے آنا۔'' اس مثال اور آیت کے الفاظ میں ہم عرض کریں کہ مشرق و مغرب کی دوری ہے، مگر ہم اس بحث میں پڑنے کے بجاے اردو کی ایک اور مثال پیش کیے دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اہل علم اس میں مغایرت کے ساتھ ساتھ تخصیص بھی پیدا ہوتے ضرور دیکھ لیں گے۔ مثال یہ ہے: ''بیٹا، پاکستانیوں اور دوسرے بچوں کو بھی ساتھ لیتے آنا۔'' اور اگر آیت کے ہر ہر لفظ کی رعایت رہے تو اس کی مثال یہ بھی ہو سکتی ہے: ''بیٹا، اپنے ساتھ پاکستانیوں، سواے اُن کے جو بالغ ہو چکے ہیں اور دوسرے بچوں کو بھی ساتھ لیتے آنا۔'' دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں مثالوں میں ''دوسرے بچوں'' کا عطف ''پاکستانیوں'' سے مغایرت کو بھی بیان کر رہا ہے اور ان ''پاکستانیوں'' کے بچہ ہونے کو بھی۔

عام بعد الخاص اور تخصیص کی وضاحت کے بعد اب ہماری پیش کردہ آیت کو بڑی آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے:

یہ بھی اصل میں اُس موقع کا بیان ہے جب عذاب کا وقت بالکل قریب آن لگا ہے اور نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ضرورت کے تمام جانوروں کے جوڑے کشتی میں رکھ لیں۔ یہ جانور غیر ذوی العقول ہیں اور اس دنیا میں برپا کیے گئے امتحان سے قطعی طور پر لاتعلق ہیں، اس لیے اُن میں سے کون سا جوڑا رکھا جائے، اس کا پیمانہ صرف یہ ہونا چاہیے کہ وہ جانور ہوں اور اُن کی ضرورت کے جانور ہوں۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'وَاَهْلَكَ' اور اس کے ساتھ اپنے اہل کو بھی سوار کرا لیں۔ اُن کے اہل، ہم جانتے ہیں کہ ذی شعور انسان ہیں اور اس وجہ سے دنیا کے اس امتحان سے گزر رہے ہیں، اس لیے اُن میں سے کون سوار کیا جائے، اس کا فیصلہ اُن کے اہل ہونے کے بجاے ان کی اہلیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ سب لوگ آپ کی رسالت کے بھی براہ راست مخاطب ہیں، اس لیے بھی ضروری ہے کہ اُن میں سے صرف ایمان والے ہی سوار کرائے جائیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہوئی کہ خدا نے 'اَهْلَكَ' پر 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کا استثنا لا کر اس بات کو بالکل صراحت کے ساتھ بھی بیان کر دیا، یعنی 'اِلَّا' کی اس تخصیص سے بتا دیا کہ اُن کے اہل میں سے صرف صاحب ایمان کشتی پر سوار ہو سکیں گے اور جو شرک پر قائم ہیں اور اس طرح خدا کے فیصلے کی زد میں آ چکے ہیں، وہ سوار ہونے سے یک سر محروم رہیں گے۔ اس کے بعد 'اَهْلَكَ' پر 'مَنْ اٰمَنَ' کا عطف لایا گیا ہے۔ اس عطف نے جس طرح دیگر مومنین کو بھی اس حکم میں شامل کر لیا ہے، اسی طرح ایک زائد قرینہ اس بات کا بھی فراہم کر دیا ہے کہ 'اَهْلَكَ'

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے مراد یہاں صرف مسلمان اہل ہیں، اس لیے کہ اس سیاق میں عطف کے ان الفاظ کا صحیح مطلب بنتا ہے: ''اور دوسرے ایمان والے بھی''۔ اور غور سے دیکھا جائے تو یہ ''دوسرے'' کا مفہوم بھی اصل میں 'اَهْلَكَ' کے اندر ایمان والوں کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔

بہر کیف، یہ دوسری آیت بھی اس معاملے میں بالکل قطعی ہے کہ نوح علیہ السلام کے خاندان کا فیصلہ بھی اسلام کے عام قانون نجات کے مطابق ہی ہوا اور کسی بھی شخص کو محض اُن کے اہل ہونے کی بنیاد پر رتی بھر کوئی رعایت نہیں دی گئی۔

اس اصول کے خلاف دلائل کا تجزیہ

نجات کے اس قانون کو ہم چاہتے ہیں کہ صرف اثباتی طور پر بیان کر دینے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ اس کی متفقہ اہمیت کے پیش نظر اس کی مخالفت میں دیے گئے دلائل پر بھی کچھ کلام کر دیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف بنیادی طور پر تین عدد دلائل دیے گئے ہیں:

پہلی دلیل

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ.(ہود ۱۱: ۴۰)

''ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں ـــــ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔''

اس آیت کے متعلق اوپر بیان ہوئی تصریحات معیار نجات کے وضوح میں ہر طرح سے کافی ہیں، مگر ان لوگوں نے اپنے ''فہم'' کی بنیاد پر اسے ہی اٹھا کر اپنی رائے کی دلیل بنا دیا ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ان کے اس آیت سے استدلال پر بھی اپنی چند گزارشات پیش کر دیں۔

ان کا کہنا ہے کہ 'مَنْ اٰمَنَ' کے عطف ہو جانے سے یہ قرینہ پیدا ہو گیا ہے کہ 'اَهْلَكَ' کو سوار کرانے میں ایمان کے بجاے اہل ہونا ہی شرط ہے۔ ہم سیاق کلام اور زبان و بیان کے تمام قاعدے ایک طرف رکھ دیں تو کسی درجے میں اس بات کو مان سکتے ہیں کہ اس عطف نے واقعی 'اَهْلَكَ' کے بارے میں یہ قرینہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن ہم جب دیکھتے ہیں کہ اس پر 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' آیا ہوا ہے تو اس بات کو فرض کر لینا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھی ہمارے لیے محال ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عطف صرف 'اَهْلَكَ' پر نہیں، بلکہ اِس استثنا سمیت 'اَهْلَكَ' پر آیا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ''تم اپنے اہل میں سے اُنھیں جو خدا کے فیصلے کی زد میں آئے ہوئے نہیں ہیں اور دوسرے مومنین کو سوار کرا لو''۔ اور ظاہر ہے، اس جملے سے اس طرح کے کسی قرینے کی پیدایش کو مان لینا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر اہل نوح کے معاملے میں بھی ایمان ہی شرط ہوتا تو اس قدر تفصیل کی کیا ضرورت تھی؟ سادہ طریقے سے کہہ دیا جاتا کہ مومنین کو سوار کرا لو۔ اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ قرآن ایک سپاٹ اور سادہ کتاب نہیں ہے کہ اسے کسی ایک طرز میں محدود کر دیا جائے۔ اسے زبان و ادب کا بھی ایک شاہ کار بنایا گیا ہے، چنانچہ اس میں جب بیانِ مدعا کیا جاتا ہے تو سیاق کی ضرورت سے متعدد اور متنوع پیرائے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ مثلاً، ہم اسی بات کو دیکھیں تو اسے ایک سے زائد طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تم اپنے ساتھ مومنین کو سوار کرا لو۔

۲۔ تم اپنے گھر والوں کو سوار کرا لو۔

۳۔ تم اپنے گھر والوں اور دیگر مومنین کو سوار کرا لو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان تینوں بیانات کی اپنی اپنی افادیت ہے۔ جیسا کہ ان میں سے پہلا ہمیں یہ بتائے گا کہ قوم نوح کی نجات کا معاملہ صرف اور صرف ایمان لانے پر منحصر تھا۔ اسے اِیجاز کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ دوسرا جملہ یہ بتائے گا کہ حضرت نوح پر زیادہ تر اُن کے اپنے گھر والے ایمان لائے، اس لیے اُن کا ذکر کر دیا تو گویا باہر کے چند مومنین کا بھی ذکر کر دیا۔ یہ علی سبیل التغلیب کا اسلوب ہے اور اسے سورۂ مومنون میں اختیار کیا گیا ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل گزری۔ ان میں سے تیسرا جملہ یہ بتائے گا کہ نجات کا قانون اپنے اطلاق میں مخاطبین کی دونوں قسموں کو محیط ہے۔ یہ اِطناب کا اسلوب ہے اور زیر بحث آیت میں اسے ہی اختیار کیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ اطناب کے اس اسلوب سے اگر اچھی طرح سے واقفیت ہو جائے تو قرآن کے بارے میں ''سادہ'' ہونے کا مطالبہ لازمی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس مقام کی رعایت سے یہ اصول بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ایک بات کو اگر مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہو تو قرآن کے طالب علموں کو اس پر سوالات اٹھانے کے بجاے صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ کس مقام پر کون سا پیرایہ کس وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔

دوسری دلیل

حضرت نوح کا بیٹا عذاب کی گرفت میں آیا اور انھوں نے 'اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ' کہتے ہوئے خدا سے التجا کی

تو اس کے جواب میں یہ کہنے کے بجاے کہ وہ ایمان نہ لایا تھا، اس لیے غرق ہوا، کہا گیا: 'اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ'، وہ تمھارے اہل میں سے نہ تھا، اس لیے غرق ہوا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہ مکالمہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل نوح کے لیے نجات کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ اُن کے اہل میں سے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس استدلال کی یہ بنیاد ہی غلط ہے کہ غرق ہونے والا نوح کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔ ہماری اس بات کو سمجھنے کے لیے فہم قرآن کا وہ بنیادی قاعدہ ضرور سمجھ لینا چاہیے جس سے یہاں مطلق طور پر بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ قرآن محض لفظوں اور منتشر جملوں کا کوئی مجموعہ نہیں ہے کہ اس میں سے ایک لفظ اٹھایا جائے اور صرف لغت کے اعتبار سے اس کی مراد متعین کر لی جائے۔ اسے کلام کی صورت میں اتارا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ الفاظ جب کسی کلام کا حصہ بن جاتے ہیں تو اپنے اندر کئی طرح کی تعیین اور تخصیص پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس قاعدے کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظ 'اَهۡلَكَ' میں بھی پیچھے آیت ۴۰ میں تخصیص ہو چکی ہے اور اس سے مراد اب محض اہل نہیں رہے، بلکہ کچھ خاص اہل ہو گئے ہیں۔ یعنی نوح علیہ السلام کے خاندان کے وہ افراد جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے بارے میں خدا کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا۔ اس لفظ میں پائی جانے والی یہی تخصیص ہے جو اِعادۂ معرفہ کے اصول پر اس واقعہ کے تفصیلی بیان میں آخر تک موجود رہی ہے۔ نوح نے التجا کرتے ہوئے جب 'اِنَّ ابۡنِيۡ مِنۡ اَهۡلِيۡ' کہا ہے تو اس سے اُن کی مراد یہی ہے کہ پروردگار، میرا بیٹا تو میرے اُن خاص اہل میں سے تھا جن کے بارے میں عذاب کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے جواب میں خدا نے جب 'اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ' کہا ہے تو اس کا مطلب بھی اب یہی ہے کہ وہ تمھارے اُن خاص اہل میں سے ہرگز نہیں تھا، بلکہ ہمارے فیصلے کی زد میں آیا ہوا شخص تھا۔ اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے 'اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ'، وہ اپنی ذات میں سراسر برائی ہو چکا تھا۔ گویا یہ آخری جملہ اُس کے غرق ہونے کی تعلیل اور اِس لحاظ سے 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ' میں بیان ہونے والے قانون ہی کا دوسرے لفظوں میں حوالہ ہے۔

یہ تو رہی آیت سے اٹھائے گئے ان کے استدلال کی حقیقت۔ باقی ہم عرض کریں کہ جہاں تک اُس ناخلف کے نسب کا تعلق ہے تو وہ ہر لحاظ سے درست ہے، اس لیے کہ خدا نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اُسے نوح ہی کا بیٹا قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَهِيَ تَجۡرِيۡ بِهِمۡ فِيۡ مَوۡجٍ كَالۡجِبَالِ ۟ قف
وَنَادٰى نُوۡحُ ۨابۡنَهٗ۔ (ہود ۱۱: ۴۲)

''وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی موجوں کے دمیان ان کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ آیت اُس کے نسب کے حقیقی ہونے میں بالکل صریح ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ ان حضرات نے اس میں بھی ایک خلط مبحث پیدا کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت نوح چونکہ اُسے لاعلمی میں اپنا بیٹا خیال کرتے تھے، اس لیے خدا نے اُنھی کے علم کی رعایت سے حکایت ماجرا کر دی ہے۔ ہم گزارش کریں گے کہ یہ حکایت ماجرا ہے، اس سے کس کو انکار ہے، مگر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ حضرت نوح کے کلام کی حکایت نہیں ہے کہ اس میں اُن کے مزعومات کا خیال رکھا جاتا، بلکہ یہ اُن کے واقعہ کی حکایت ہے اور خدا کی طرف سے ہو رہی ہے، اس لیے لازم تھا کہ اس میں صرف اور صرف حقائق کو بیان کیا جاتا۔ اب وہ ناخلف چونکہ واقعہ میں اُنھی کا اپنا بیٹا تھا، اس لیے خدا نے اسی حقیقت کو یہاں بیان کر دیا ہے۔ بلکہ ہم عرض کریں کہ معاملہ اگر اس سے الٹ ہوتا اور اُس شخص کا نسب واقعہ میں درست نہ ہوتا تو اِس کے لیے 'نَادٰی نُوۡحُ اِۨبۡنَهٗ' کے الفاظ کسی طرح بھی موزوں نہ ہوتے۔ اس کے لیے 'نادی نوح الذي يزعم ابنه' یا اسی طرح کے الفاظ لائے جاتے جو حکایت کے اعتبار سے بھی موزوں ہوتے اور اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا کہ اُس کی ولدیت کے غیر حقیقی ہونے کا اس مناسب مقام پر ایک واضح سا اشارہ بھی ہو جاتا۔[۴]

ان حضرات کی غلطی ایک اور زاویے سے بھی سمجھ لینی چاہیے۔ فرض کریں کہ اگر یہاں حضرت نوح کے واقعہ کے بجاے اُن کی بات نقل کی جا رہی ہوتی تو قرآن کے اندازِ حکایت سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے یہ صراحت لازماً کرتا کہ یہ نوح کی اپنی بات ہے۔ اور اسی طرح اگر یہ بات غلط ہوتی تو اس کی بر سر موقع تردید بھی کرتا یا کم سے کم اس کے غلط ہونے کی طرف ایک اشارہ ضرور کر دیتا۔ عرب کے مشرکین اپنا دین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ایک جگہ اُن کی طرف سے اُن کے دین کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'فَقَالُوۡا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعۡمِهِمۡ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا'[۵] (اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے)۔ یہاں مشرکین کی بات کے بیچ ہی میں ''بزعم خود'' کا لفظ لایا گیا ہے تاکہ قارئین کے سامنے فوری طور پر اس چیز کی وضاحت کر دی جائے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا نہیں، بلکہ اُن کا اپنا بنایا ہوا دین ہے۔ بلکہ یہ وضاحت اس قدر ضروری ہوتی ہے کہ خود ان حضرات

۴۔ بلکہ اس کے بعد 'يٰبني اركب معنا' کے الفاظ لانے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ ہوتی، جیسا کہ ان حضرات کو اس کا خیال ہو گیا ہے۔

۵۔ الانعام ۶: ۱۳۶۔

نے بھی جب حکایت ماجرا ''سمجھانے'' کے لیے ایک مثال پیش کی ہے تو وہ بھی اس میں ''بقول'' کا لفظ لانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ان کی مثال یہ ہے: ''بقول نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔''

اس ذیل میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ذوالقرنین کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے جو فرمایا ہے کہ ''جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ تک پہنچا تو اس نے سورج کو دیکھا کہ ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہے۔''[۶] تو یہ اصل میں انسانی آنکھ کے مشاہدے کا اعتبار کیا ہے اور زبان کے قواعد کی رو سے یہ بالکل جائز ہے کہ حقیقت حال معلوم ہونے کے باوجود اس کا اعتبار کیا جائے۔ مثال کے طور پر، زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے اور اس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں، یہ بات جان لینے کے بعد بھی ہمارے لیے روا ہے کہ ہم کہیں کہ سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں کہ انسان کی ظاہری آنکھ سے ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس طریق بیان کا زیر بحث آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ اُس شخص کی ولدیت کے بارے میں ایک حقیقت ہو اور ایک اُس کے بارے میں انسان کا مجموعی طور پر کوئی مشاہدہ ہو، بلکہ یہ کسی بات کے حقیقت ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ ہے اور ہم زبان کے کسی ایسے قاعدے سے واقف نہیں ہیں جو ہمیں اجازت دیتا ہو کہ ہم دونوں ہی امور کی یکساں طور پر حکایت کر سکیں، یعنی اُس شخص کی ولدیت کا علم ہونے کے باوجود، محض حضرت نوح کی لاعلمی کا لحاظ کرتے ہوئے حقیقت حال سے مختلف بات کہہ سکیں، اور بالخصوص اُس سیاق میں جہاں حکایت کرنے والا ان حضرات کے بقول اس غلط فہمی کی اصلاح بھی کرنا چاہتا ہو۔

تیسری دلیل

یہ تیسری دلیل اصل میں پہلے دو دلائل کو مؤکد کرنے کے لیے لائی گئی ہے۔ اس کے ذریعے سے یہ لوگ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ صرف نوح کے اہل کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ دیگر انبیاے کرام کے اہل کو بھی یہ حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس میں انھوں نے متنوع استدلالات پیش کیے ہیں، ہم ذیل میں قدرے اختصار سے ان پر تبصرہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ کس حد تک ''اطمینان'' بخش ہیں:

۱۔ اس خصوصیت کے اثبات میں انھوں نے ایک سوال نما استدلال یہ کیا ہے کہ جس طرح حضرت نوح کے واقعے میں 'اہل' کا لفظ آیا ہے، اسی طرح حضرت لوط کے واقعے میں بھی اسے لایا گیا ہے اور آخر اس کی کوئی تو وجہ

۶۔ الکہف ۱۸: ۸۶۔

ہے؟اس پر ہم عرض کریں کہ اس کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو، بہر حال یہ نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے اہل محض اہل ہونے کی وجہ سے نجات کے مستحق ہیں، بلکہ قرآن کی رو سے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نوح پر اُن کے اہل بھی ایمان لائے تھے، اس لیے نجات کے فیصلے میں اُن کا بھی ذکر کیا، اور مزید یہ کہ ایمان لانے والوں میں سے زیادہ تر کا تعلق آپ کے اہل سے تھا، اس لیے بعض جگہ صرف اُنھی کا ذکر کر دیا۔[7] اور جہاں تک حضرت لوط کا معاملہ ہے تو قرآن بتاتا ہے کہ اپنے گھر کے سوا اُن پر کوئی گھر ایمان نہ لایا: 'فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ'[8]۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ خدا نے صرف اُن کے اہل کا بیان کیا اور خود اُنھوں نے بھی جب دعا کی تو اس میں نوح کے برعکس، صرف اپنے اہل کا ذکر کیا۔

اس ذیل میں ان حضرات نے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ جب خاندان کی بات ہوئی ہے تو جس طرح نوح کے بیٹے کو اس میں سے خارج سمجھا گیا، لوط کی بیوی کو بھی خارج از اہل بیت سمجھا گیا۔ حضرت نوح کے بیٹے کے بارے میں تو ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ وہ کس معنی میں آپ کے اہل میں سے خارج قرار دیا گیا۔ جہاں تک حضرت لوط کی بیوی کا معاملہ ہے تو اُس پر ہم عرض کریں گے کہ یہ عورت تو بہر صورت، آپ کے اہل میں سے تھی، مگر پھر بھی اُسے خارج قرار دیا گیا تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ نجات کے فیصلے میں اسے بھی اُسی خاص معنی میں، یعنی صاحب ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اہل میں سے خارج سمجھا گیا۔

۲۔ ان کا کہنا ہے کہ نوح کے بعد ذریت انبیا کو ایک اہمیت حاصل رہی ہے۔ نوح برگزیدگی پاتے ہیں تو اس کا صلہ اُنھیں یہ بھی ملتا ہے کہ اُن کی اولاد میں نبیوں کی آمد کا وعدہ شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت پر سرفراز کیا جاتا ہے تو وہ بھی اپنی ذریت میں اس کے اجرا کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کے اس استدلال اور زیر بحث مسئلہ میں شاید ہی ادنیٰ درجے کی کوئی مطابقت ڈھونڈی جا سکے۔ دعویٰ کیا جا رہا تھا کہ انبیاے کرام کے اہل محض اُن کے اہل ہونے کی وجہ سے نجات پاتے ہیں اور دلیل دی جا رہی ہے کہ اُن کی ذریت میں نبوت اور امامت جاری کی گئی۔ کس کو شک ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں پر یہ سب افضال و عنایات ہوئیں،، مگر سوال تو یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ کہاں سے ہو گیا کہ اب اُن کے لیے اہلیت کی شرط بھی ختم کر دی گئی؟ قرآن تو ہمیں بتاتا

۷۔ اور اس کی دلیل میں سورۂ مومنون کی آیت ۲۷ دیکھ لی جا سکتی ہے۔

۸۔ الذاریات ۵۱: ۳۶۔

ہے کہ وہ نبوت دینے کا فیصلہ اپنے علم کی بنیاد پر کرتا ہے[9]، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُس نے انبیا کی ذریت میں سے جن لوگوں کو بھی نبوت عطا فرمائی، وہ اُس کے علم کے مطابق کامل ترین لوگ اور مرتبۂ احسان پر فائز شخصیات تھیں[10]۔ اسی طرح اُس نے جب ابراہیم کو امامت عطا فرمائی تو اہلیت کی اسی شرط کے مطابق فرمایا کہ اُس کا وعدہ اُن کی ذریت میں سے ظالم لوگوں کو ہرگز شامل نہ ہوگا۔[11]

۳۔ ان حضرات نے اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو بھی ایک اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہم عرض کریں گے کہ ہاں، ایسا ہی ہے، نبیوں کے تمام متعلقین کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بالکل بھی نہیں ہوتا کہ وہ نجات کے باب میں کسی خاص حیثیت کے حامل ہو گئے ہیں، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اُن کا معاملہ اس تعلق کے حوالے سے اور زیادہ حساس ہو گیا ہے۔ انھیں اب دوسروں سے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کرنا اور اس کے موید بن جانا ہے، اور اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے اس تعلق کی وجہ سے وہ پیغمبروں کے ساتھ روا رکھی جانے والی عداوت کا بھی خصوصی طور پر نشانہ بن جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں اسی وجہ سے فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی فرماں بردار بنی رہیں گی تو انھیں اس وجہ سے کہ وہ آپ کی ازواج ہونے کے ناتے منافقین کی شرارتوں کا خصوصی ہدف بن گئی ہیں، اجر بھی دہرا ملے گا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ اگر وہ کسی برائی میں ملوث ہوں گی تو اس تعلق کی وجہ سے کوئی خصوصی رعایت ملنا تو بڑی دور کی بات، اس پر اُنھیں عذاب بھی دہرا دیا جائے گا۔[12]

۴۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح نصاریٰ کے خلاف مباہلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کی ہلاکت اور نجات معیار قرار پائی تھی، ہو سکتا ہے کہ حضرت نوح اور لوط کی پوری دعوت مباہلہ بن گئی ہو اور اُن کے اہل کا بچایا جانا لازم ہو گیا ہو کہ یہ اُن کے حق پر ہونے کی دلیل ہوتا۔ یہ ان حضرات کی جانب سے کیا ہوا سراسر قیاس

۹۔ الانعام ۶: ۱۲۴۔

۱۰۔ الانعام ۶: ۸۴-۸۵۔

۱۱۔ البقرہ ۲: ۱۲۴۔

۱۲۔ الاحزاب ۳۳: ۳۰-۳۱۔

ہے، وگرنہ قرآن میں نہ تو اس دعویٰ کی کوئی دلیل پائی جاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل کی نجات حق و باطل کا معیار قرار پائی تھی اور نہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل ملتی ہے کہ حضرت نوح اور لوط نے کبھی اپنے اہل کی نجات کو معیار قرار دیا تھا۔ اصل میں مباہلے کی آیات سے ان لوگوں کو مغالطہ ہو گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ان کے بارے میں چند باتیں اچھی طرح سے سمجھ لی جائیں: ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے رہنما اور وکیل کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے جب فرمایا ہے: 'فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ'، تو یہ الفاظ اس معاملے میں بالکل صریح ہیں کہ مباہلے میں صرف آپ اور آپ کے اہل و عیال کو شریک نہیں ہونا تھا، بلکہ اہل کتاب کی جماعت کے مقابلے میں مسلمانوں کی پوری جماعت کو شریک ہونا تھا۔ چنانچہ اس عمومی نوعیت کے معاملے سے صرف آپ کے اہل کی خصوصی حیثیت کا استدلال کرنا، کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ 'فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ' اور 'ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ'[13] کے الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ مباہلہ اصل میں دلائل کے مقابلے میں مکابرت کرنے والوں پر محض خدا کی لعنت کرنے کا ایک طریقہ تھا[14]۔ چنانچہ اس کی بنیاد پر یہ کہنا بالکل بھی روا نہیں ہے کہ اس میں کسی کی ہلاکت و نجات کو معیار قرار دے دیا گیا تھا۔[15]

۵۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ آفرینی یہ بھی ہوئی ہے کہ بنی اسرائیل کا مصر سے خروج اور فرعون کے ساتھ غرق ہونے سے نجات اُن کے ایمان کی وجہ سے نہیں، بلکہ اِس وجہ سے ہوئی تھی کہ وہ حضرت اسرائیل کی اولاد تھے۔ ان کے اس استدلال میں، حسب معمول، ایک سے زائد غلط فہمیاں موجود ہیں۔ انھیں رفع کرنے کے لیے

۱۳۔ آل عمران ۳: ۶۱۔

۱۴۔ اور یہ طریقہ اس موقع کے ساتھ خاص بھی نہ تھا، بلکہ اسے دوسرے مواقع پر بھی اختیار کیا گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رِعل اور ذکوان جیسے قبائل پر پورا مہینا لعنت فرماتے رہے (مسلم، رقم ۱۵۸۴)۔

۱۵۔ اس لعنت کا نتیجہ، البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے بعد جھوٹوں کو ہلاک کر دیا جاتا اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ اُن پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی جاتی۔ اگر اہل کتاب کے بارے میں خدا کی سنت کا لحاظ رہے تو اس دوسرے نتیجے کے وقوع پذیر ہونے کا زیادہ امکان تھا۔

یہ جاننا ازحد ضروری ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل اور آل فرعون کی طرف ہونے والی بعثت میں کیا فرق تھا اور اس کی تفصیلات کیا کچھ تھیں۔ خدا نے کبھی توفیق دی تو اس پر اپنا حاصل مطالعہ پیش کریں گے۔ سر دست، ان کے استدلال کے جواب میں چند باتیں واضح رہیں۔

ایک یہ کہ بنی اسرائیل بے یقینی، بداعتقادی اور سرکشی جیسی بیماریوں میں ضرور مبتلا ہوئے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ نہ صرف مسلمان، بلکہ لوگوں پر حق بات کی شہادت دینے کے لیے خدا کی طرف سے مامور کی گئی ایک قوم تھے[16]۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی خدا کا رسول مانتے تھے[17] اور اُنھیں یہ حیثیت بھی دیتے تھے کہ محض مستقبل کے ایک وعدے پر دور دراز کے صحرائی اور پر کٹھن سفر میں اُن کے ہم رکاب ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ گمان کرنا ہر گز درست نہیں ہے کہ اُن کے ساتھ جو معاملات ہوئے، وہ ایمان کے بجاے صرف اور صرف اُن کے نسب کی رعایت سے ہوئے۔ دوسرے یہ کہ اُن کا مصر سے خروج ہو یا دریا سے پار اتر جانا، یہ خدا کے عذاب سے نجات کا معاملہ سرے سے نہ تھا کہ اس سے کوئی شخص اپنی راے کے حق میں دلیل اٹھا لائے، بلکہ یہ اُن پر ہونے والا سراسر خدا کا احسان تھا اور یہ بھی یاد رہے کہ اس کے نتیجے میں وہ خدا کے نہیں، بلکہ فرعون کے عذاب سے بچائے گئے تھے[18]۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ نبیوں کی اولاد ہونے کی بنیاد پر جزا و سزا کے خدائی قانون سے کبھی مبرا نہ ہوئے، بلکہ ہم جانتے ہیں کہ اُن کی طرف سے جب بھی جرم کا ارتکاب ہوا، اُنھیں اس کی سزا بھی بڑی سخت اور دردناک ملی، حتیٰ کہ شرک کرنے کی پاداش میں اُنھیں قتل تک کی سزا سنائی گئی۔[19]

ایمان ہی نجات کی دلیل ہے، اس بنیادی اصول کے خلاف یہ ان لوگوں کے دلائل اور ان کی حقیقت ہے۔ سو آخر میں ہم ایک گزارش کرنا چاہیں گے۔ یہ اصول خدا کی رحمت کا تقاضا اور اُس کے بے لاگ انصاف کا مظہر ہے اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول، بلکہ ہمیشہ سے اُن کے لیے سرمایۂ افتخار رہا ہے۔ یہ تو اصل میں یہود تھے جنھوں نے نبیوں کی اولاد ہونے کے زعم میں مبتلا ہو کر اس میں استثنا پیدا کیا اور نجات کے معاملے میں اپنی

۱۶۔ البقرہ ۲: ۴۷۔

۱۷۔ المومن ۴۰: ۲۵۔ الصف ۶۱: ۵۔

۱۸۔ البقرہ ۲: ۴۹۔

۱۹۔ البقرہ ۲: ۵۴۔

خصوصی حیثیت کے دعوے دار ہو گئے۔ وگرنہ خدا نے تو کسی شخص کو نہ اس سے مستثنیٰ قرار دیا اور نہ اس طرح کی کسی کوشش کو کبھی جائز قرار دیا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے قرآن میں یہود کے ان مزعومات کا ہزار طریقوں سے جواب دیا۔ لہٰذا، ہم مسلمانوں کے لیے یہی زیبا ہے کہ ہم اس اصول کو جی جان سے مانیں۔ اسے بے کم و کاست اور من و عن قبول کریں اور اس میں رتی بھر کسی تبدیلی کے روادار نہ ہوں۔ اور ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہم اس اصولِ انصاف کے مؤید اور داعی بنا کر کھڑے کیے گئے ہیں، نہ کہ مخالف اور اسے بے اثر کر دینے والے بنا کر۔

امرأة نوح

(۳)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض پیغمبروں نے جب لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف دعوت دی تو اُن کی اپنی بیویوں نے بھی کہ جن پر انسان کو سب سے زیادہ اعتماد ہوا کرتا ہے، اُن سے حد درجہ بے وفائی کی اور معاون ہونے کے بجاے اس دعوت کے مخالفین کا ساتھ دینے پر اصرار کیا۔ نبوت کی تاریخ میں اس کی ایک سے زائد مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کے اس طرز کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ. (التحریم ۶۶: ۱۰)

''اللہ منکروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں، مگر انھوں نے اپنے شوہروں سے بے وفائی کی تو اللہ کے مقابلے میں وہ ان کے کچھ کام نہ آ سکے اور دونوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔''

یہاں 'فَخَانَتٰهُمَا'، یعنی بے وفائی کے الفاظ آئے ہیں اور اس سے مراد اُن عورتوں کی طرف سے سرزد ہونے والا کفر ہے اور یہ اس آیت کا سیدھا اور صاف مطلب ہے۔ بعض حضرات نے اس کا ایک اور ہی مطلب پیش کیا ہے۔ ان کے بقول یہاں جس بے وفائی کا ذکر ہوا ہے، اس سے مراد بدکاری ہے کہ 'خیانت' کا لفظ